پاکستان ، عصر نو اور اقبال کے تصورات

ڈاکٹر سعادت سعید

ABSTRACT:
Creation of Pakistan is one of the greatest events of the world in 20th century. In this article, political and social concepts and ideals of Allama Muhammad Iqbal are elaborated in historical perspective. Iqbal has basically emphasized on the spiritual aspect of the society by highlighting the freedom and ego of an individual.

علامہ محمد اقبال نے مسلمانوں کے لیے جس نوع کی ریاست کا خواب دیکھا تھا اس میں انسانیت کے حوالے سے تین باتوں کا ہونا ضروری ہے ۔ایک کائنات کی روحانی تعبیر دوسرے فرد کی روحانی آزادی اور تیسرے آفاقی اہمیت کے وہ اصول کہ جو انسانی معاشرے کی نشو و نما کو روحانی بنیادیں فراہم کریں۔ ان کا خیال تھا کہ جدید مغربی فکر نے ان بنیادوں پر تصوراتی نظاموں کی صورت گری کی ہے۔علامہ محمد اقبال کا خیال تھا کہ تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ خالص عقل یا فلسفہ جن صداقتوں کی نشاندہی کرتا ہے زندہ ایقان کی اس حرارت اور گرمی کو سامنے لانے سے قاصر رہتے ہیں کہ جسے صرف ذاتی الہام سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ بقول اقبال اسی وجہ سے خالص فکر نے بہت کم لوگوں کو متاثر کیا ہے۔ اس کے مقابلے میں مذہب نے انسانی افراد کو درجہ استکمال تک پہنچانے کا عمدہ کام کیا ہےیوں کئی معاشروں کی قلب ماہیت ممکن ہو سکی ہے۔ اقبال لکھتے ہیں :

The idealism of Europe never became a living factor in her life, and the result is a perverted ego seeking itself through mutually intolerant democracies whose sole function is to exploit the poor in the interest of the rich. Believe me, Europe today is the greatest hindrance in the way of man's ethical advancement. The Muslim, on the other hand, is in possession of these ultimate ideas on the basis of a revelation, which, speaking from the inmost depths of life, internalizes its own apparent externality. With him the spiritual basis of life is a matter of conviction for which even the least enlightened man among us can easily lay down his life; and in view of the basic idea of Islam that there can be no further revelation binding on man, we ought to be spiritually one of the most emancipated peoples on earth. Early Muslims emerging out of the spiritual slavery of pre-Islamic Asia were not in a position to realize the true significance of this basic idea. Let the Muslim of today appreciate his position, reconstruct his social life in the light of ultimate principles, and evolve, out of the hitherto partially revealed purpose of Islam, that spiritual democracy which is the ultimate aim of Islam.

Lecture VI: The Principle of Movement in the Structure of Islam

علامہ محمد اقبال کے کلام مینبھی جس روحانی جمہوریت کے نقوش ابھارے گئے ہیں وہ استبدادی دیو کی انتقامی دھمالوں سے کوئی سروکار نہیں رکھتی۔ اسے کسی بھی صورت آزادی کی نیلم پری کا نام نہیں دیا جا سکتا ہے۔اسلامی جمہوریت میں رنگ، نسل، قوم، زبان اور سرمایے کی بنیاد پر فیصلے

نہیں ہوتے اور نہ ہی ان کی بنیادوں پر سیاسی نظام کی شکل سامنے لائی جا سکتی ہے۔ اسلامی جمہوریت میںافراد کو بنیادی عزت دی جاتی ہے ۔اس میں محنت کشوں کو ان کا مناسب حق دیا جاتا ہے۔اس کے بیت المال سے لوگوں کے مسائل حل کیے جاتے ہیں۔اس میں کوئی انسان کسی دوسرے کا غلام نہیں ہوتا ۔اقبال ایسے جمہوری معاشروں کو پسند نہیں کرتے تھے کہ جن میں انسانوں کو غلامی کے بندھنوں میں باندھا جاتا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

آدم از بے بصری بندگی آدم کرد
گوہرے داشت ولے نذر قباد و جم کرد
یعنی از خوئے غلامی ز سگاں خوار تر است
من نہ دیدم کہ سگے پیش سگے سر خم کرد

علامہ محمد اقبال جس روحانی جمہوریت کے قائل تھے اس میںافراد کو بنیادی عزت اور آزادی میسر ہوتی ہے۔اور کوئی وہاں کسی کا محتاج نہیں ہوتا۔بقول اقبال

کسی نہ گردد درجہاں محتاج کس
نکتۂ شرعِ مبیں این است وبس

اسلامی شرع کے اس نکتے کو بیان کرتے ہوئے اقبال نے کوشش اور جدو جہد کے معاملات کو بھی بہت اہمیت دی ہے۔اور کہا ہے کہ کسی سرمایہ دار کو '' لیس للا نسان الاماسعیٰ'' کے حوالے سے حاصل کیے گئے مزدور کے سرمایے کو چھیننے کا کوئی حق نہیں ہے۔اور یہ کہ وہ دہ خدا سے بھی مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ یہ زمینکسی کی ملکیت نہیں ہے اور الارض للہ کے معنی کو سمجھنے کے بعد اگر کوئی زمین کا مالک بننے کے خواب دیکھتا ہے تو وہ ہٹ دھرمی ہی کا مظاہرہ کر رہا ہوتا ہے۔

حق زمیں راجز متاعِ مانگفت
ایں متاع بے بہا مفت است مفت

اور یہ حقیقت بھی اظہر من الشمس ہے کہ ہم زمین سے رزق حاصل کرتے ہیں اور مرنے کے بعد اسی زمین میں دفنائے جاتے ہیں اس لیے یہ نکتہ سمجھنے کا ہے کہ اس سے یہ چیزیں حاصل کر اسے اپنی ملکیت نہ بنا۔

دہِ خدایا! نکتۂ از من پذیر
رزق و گو راز وے بگیر او رامگیر

علامہ اقبال نے جدید سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد جس سود پر ہے اسے بھی ناپسندیدہ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ بینک کہ جو چالاک یہودیوں کے فتنہ خیزافکار کی پیداوار ہیں انہوں نے انسان کے سینے سے نور حق کو چھین لیا ہے اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ سود سے جو فتنے پیدا ہوتے ہیں ان کی کوئی حد نہیں ہے لیکن قرض حسنہ میں اپنی لذت ہے۔ سود سے جان تاریک ہو جاتی ہے اور دل خشت و سنگ میں ڈھل جاتا ہے اور آدمی ایک ایسے درندے کا روپ اختیار کر لیتا ہے کہ جس کے دانت اور پنجے نہیں ہوتے:

ایں بنوک ایں فتنہ چالاک یہود

نور حق از سینہ آدم ربود اور یہ کہ
از ربا آخرچہ می زاید فتن
کسی نداند لذتِ قرضِ حسن
از ربا جان تیرہ دل چوں خشت و سنگ
آدمی درندہ بے دندان و چنگ

جدید سامراج نے بقول ڈاکٹر علی شریعتی''دنیا کو تین مختلف نسلوں میں منقسم کر دیا ہے۔ پہلی نسل یورپی لوگوں پر مشتمل ہے جو قدیم یونانی دور سے لے کر عصر حاضر تک غور و فکر میں مہارت رکھتی ہے جو حساس ہے اور شاعری تخلیق کر سکتی ہے۔ دوسری نسل مشرقی ہے جو صوفیانہ اور عرفانی احساسات سے مملو ہے اور تیسری سیاہ فام نسل جو رقص کر سکتی ہے ، گا سکتی ہے اور اچھا جاز بجا سکتی ہے۔ چنانچہ یوں انہوں نے غیر یورپی معاشروں میں سو سال تک جدید و قدیم کا نزاع تخلیق کیا۔ یہ نزاع تھا اور ہے۔ اس سے زیادہ بے معنی جنگ آج تک دیکھنے میں نہیں آئی۔ فطرتا اس جنگ میں فتح جدیدیت ہی کو حاصل ہوئی۔ بعد ازاں غیر یورپی معاشرے اپنے بظاہر خام خیال اور غیر روشن فکر دانشوروں کی راہنمائی میں جدید بننے کے لئے جانفشاں ہوئے۔ انہوں نے پیدا کنندگان اور صارفین کے مابین دلال کا کردار ادا کیا۔ ایک ایسے ثالث نے جو اپنے اور یورپی لوگوں سے مانوس تھا استحصال اور آباد کاری کا راستہ ہموار کیا۔''

مغربی صارفیت کی اندھی تقلید کے خلاف علامہ محمد اقبال نے کھل کے لکھا ہے اور کہا ہے کہ ہمیں مغربی ثقافتی یلغار سے محفوظ رہنے کے لیے اپنے کلچر کی بازگشت کا کام کرنا ہے ۔پاکستان اسی بازگشت کو عملی شکل دینے کے لیے وجود میں آیا تھا۔اس ثقافتی بازگشت کے نتیجے میں ہمارے رہن سہن کے طریقے،لباس ، آداب ، اور عمومی اخلاقی رویوں میں جو فرق آتا سو آتا لیکن ہم نے ایک ایسی تہذیب اور زبان کو اپنے لیے ناگزیر قرار دے دیا ہے کہ جو فی زمانہ بے بس اور مظلوم ممالک پر بالواسطہ یا بلا واسطہ قبضہ کرنے کے لیے مہلک ہتھیار کا کام کر رہی ہے۔فا اعتبر یا اولی الابصار۔اہل بصارت عبرت پکڑو اور اپنی بصیرتوں کے مستور و مسدود رستوں کی جانب بڑھو اور اپنے تشخص سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرو کہ ہماری تہذیب ہماری حفاظت کا واحد ذریعہ ہے ۔یہ تہذیب قرانی تہذیب ہے کہ جو انسانوں کے لیے امن اور رحمت کے پیغام سے مملو ہے۔اقبال نے قران کے سماجی اور سیاسی مفہوم کو یہ کہہ کر واضح کیا ہے کہ قرآن کی حقیقت یہ ہے کہ یہ آقا کے لیے موت کا پیغام ہے اور ایسے انسانوں کی مدد کرتا ہے جن کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔

چیست قراں خواجہ را پیغام مرگ
دستگیر بندہ بے ساز وبرگ

اور جب ہم دین کو سیاست سے الگ کرنے کا کام بھی سر انجام دے چکے ہیں تو چنگیزیت کے چنگل میں پھنس چکے ہیں۔ کسی ملک ،قوم ، اور ملت کو مستحکم رکھنے کے لیے مذہب کے ساتھ ساتھ معیشت کی مضبوطی بھی بنیادی چیزہے اور اسی لیے اقبال نے اپنی سب سے پہلی نثری تصنیف ''علم الاقتصاد'' کے حوالے سے شائع کی ۔اور پھر اس موضوع کو اپنی ہر کتاب میں یاد رکھا۔اس حوالے سے

میٹافزکس ان پرشیا ہو ، ری کنسٹرکشن ان ریلیجیئس تھاٹ ہو، بانگ درا، بال جبریل ، ضرب کلیم ،ارمغان حجاز جیسی ان کی اردو شاعری پر مشتمل کتابیں ہوں یا اسرار خودی، پیام مشرق ،جاوید نامہ،زبور عجم اور پس چہ باید کرد اے اقوام شرق جیسے فارسی شعری مجموعے ہوں انہوں نے سیاست، مدنیت، عمرانیات، بشریات، تصوف، فلسفہ وغیرہ کے موضوعات کے ساتھ ساتھ معیشت کے موضوع کو کبھی فراموش نہیں کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ نئے زمانے کا سب سے بڑادفاعی ہتھیار کسی قوم کی مستحکم معیشت ہے۔اس حوالے سے وہ قران پا ک میں موجود ''الارض اللہ'' اور ''قل العفو '' کے تصورات کو بنیادی اہمیت دیتے تھے۔اس کا مطلب ہے کہ زمین خدا کی ملکیت ہے اور ضرورت سے زائد مال مستحقین میں تقسیم کرو۔اور اسلامی معیشت میں ''الکاسب حبیب اللہ'' کا خیال موجود ہے یوں کسی قوت کو کسی محنت کش یا کسان کا استحصال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔اس حوالے سے اقبال انقلاب کا نعرہ بھی لگاتے ہیں کہ آقا نے مزدور کی رگوں کے خون سے خالص لعل حاصل کیے ہیناور جاگیرداروں کے مظالم سے کسانوں کی کھیتیاں بربا ہو گئی ہیں اس لیے انقلاب کی ضرورت ہے۔

خواجہ اس خون رگ مزدور سازد لعل ناب
از جفائے دہ خدایاں کشت دہقاناں خراب
انقلاب اے انقلاب اے انقلاب

ان کا یہ بھی خیال تھا کہ اگر زمامِ کار مزدور کے ہاتھوں میں بھی تو بھی جب تک روحانی حوالے سے کاروبار اور کام کی اہمیت کو نہیں سمجھا جا ئے گا تو طریق کوہکن میں بھی پرویزی حیلے نظر آئیں گے۔اور دستِ فطرت نے جن گریبانوں کو چاک کیا ہے وہ مزدکی منطق کی سوزن سے رفو نہیں ہو سکتے ۔ اور عصرِ حاضر ایسا ملک الموت ہے جس نے انسانوں کی روحیں قبض کر کے انہیں فکرِ معاش کے جھمیلوں میں مبتلا کیا ہے۔ اقبال کا یہ خیال بنیادی اہمیت کا حامل ہے کہ جوحقیقت حرفِ قل العفومیں پوشیدہ ہے وہ شاید اس دور میں نمودار ہو جائے۔

علامہ اقبال اپنی زندگی کے دور آخر میں ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' کے نام سے ایک ایسی مثنوی تخلیق کر گئے ہیں کہ جس میں موجود جدیدمسلم ریاست کی تعمیر کے تصورات آج بھی اتنے ہی اہم ہیں کہ جتنے خود ان کے اپنے زمانے میں تھے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اسلامیان ہند نے ان کے تصورات کی روشنی میں ایک مسلم ریاست تو قائم کر لی ہے لیکن اس کے جو سیاسی، مذہبی، اخلاقی اور تہذیبی تقاضے ہیں ان کی تکمیل کی طرف ابھی تک سنجیدگی سے قدم نہیں اٹھائے گئے۔اس کی وجوہات سے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے محب وطن افراد پورے طور پر آگاہ ہیںکسی قوم کے بظاہرآزاد ہونے کے باوجود اگر اس کے پاس اپنے اعمال و افعال کو خود مختارانہ انداز سے ادا کرنے کااختیارنہیں ہے تو اس کی آزادی کے مقاصد ادھورے رہیں گے۔ اسلامی ریاست کے منجملہ مقاصد میں سے ایک مقصد اتنا اساسی ہے کہ اس پر عمل کیے بغیر اس ریاست کے ظاہری نقوش بھی اسلامی نہیں ہو سکتے۔یہ مقصد کلمہ توحید کی معروضی تفہیم اور اس کے مطابق کسی مملکت کی مذہبی اور سیاسی نشو و نما سے تعلق رکھتا ہے۔ کلمہ طیبہ کا مفہوم انتہائی سادہ ہے لیکن اس پر عمل کرنا انتہائی مشکل بنایا جا رہا ہے۔اس کا مفہوم یہ ہے کہ ''خدا کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے اورمحمد ﷺ خدا کے رسول

ہیں ‘‘۔اس حوالے سے نبی آخر الزماں پر نازل ہونے والے قران مجید میں موجود اسلامی نظام کی پیروی ہمارا فرض اولین ہے۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں ہے اس لیے کہ ہم دن رات اسی قسم کے خیالات کو سنتے رہتے ہیں ۔لیکن اس نظام کے بارے میں جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے اور اگر کوئی اس کی حقیقی تعبیر کرنے کی کوشش کرے تو اس کی راہ میں سرمایہ دارانہ جمہوریت کا ایک ایسا پہاڑ کھڑا کر دیا جاتا ہے کہ جسے ہٹانے کے لیے ایک ایسے انقلاب کی ضرورت پیش آتی کہ جسے اقبال نے کلام پاک کے مقصد اولیٰ کے حوالے سے ہمیں سمجھایا ہے۔ بال جبریل، جاوید نامہ اور ’اب کیا کرنا چاہیے اے مشرقی قومو‘‘ یعنی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق میں انہوں نے ایک کلمہ توحید کی روح کو سمجھانے کے جو اشعار لکھے ہیں ان میں سے چند ایک آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہوں گا۔ اقبال لکھتے ہیں:

اس سلسلے میں ایک تو وہ پوری غزل دیکھئے جس کا مطلع ہے:

خودی کا سر نہاں لا الہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الہ الا اللہ

اور مثنوی پس چہ باید کرد کے عنوان لا الہ الا اللہ کے سارے اشعار بھی دیکھئے جو سب کے سب توحید وجودی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں ۔ جاوید نامہ میں بھی مختلف مقامات خصوصا فلک مشتری کے تحت اس پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے ان سب کا مطالعہ ضروری ہے ۔ میں یہاں چند اشعار نقل کروں گا ۔

تا دو تیغ لا و الا داشتیم
ماسوی اللہ را نشان نگذاشتیم
تا نہ رمز لا الہ آید بدست
بند غیراللہ را نتواں شکست
ایں کہ می بینی نیرزد با دو جو
از جلال لا الہ آگاہ شو
ہر کہ اندر دست او شمشیر لا است
جملہ موجودات را فرماں روا است
عشق را از شغل لا آگاہ کن
آشنائے رمز الا اللہ کن
بر سر ایں باطل حق پیرہن
تیغ لا موجود الا ھو بزن
اے پسر ذوق نگہ از من بگیر
سوختن در لا الہ از من بگیر
لا الہ گوئی بگو از روئے جاں
تا ز اندام تو آید بوئے جاں

مہر و ماہ گردد ز نور لا الہ
دیدہ ام ایں سوز را در کوہ و کہہ
ایں دو حرفے لا الہ گفتار نیست
لا الہ جز تیغ بے زنہار نیست
زیستن با سوز اوقہاری است
لا الہ ضرب است وضرب کاری است
اے مسلمان نقش ایں دیر کہن
از دو حرف ربی الاعلی شکن
چساں مومن کند پوشیدہ را فاش
ز لا موجود الا اللہ دریاب
از ضمیر لا الہ آگاہ اوست
تیغ لا موجود الا اللہ اوست
ترجمہ (ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم (

جب تک ہمارے پاس لا اور الا کی دو تلواریں تھیں ہم نے ماسوی اللہ کا نشان تک نہیں رہنے دیا تھا
۔

جب تک لا الہ کی رمز ہاتھ نہیں آتی غیر اللہ کے بند کو توڑا نہیں جا سکتا ۔

یہ جو کچھ تم دیکھتے ہو (یعنی غیر اللہ)یہ دو جو کی قیمت نہیں رکھتا پس لا الہ کے جلال سے آگاہ ہو۔

جس کے ہاتھ میں شمشیر لا ہے وہ جملہ موجودات کا فرماں روا ہے ۔

اپنے عشق کو شغل لا سے آگاہ کر اور الا اللہ کی رمز سے آشنا کر

اس باطل حق پیرہن (غیر اللہ یا کائنات پر) پر لا موجود الا ھو کی تلوار چلا ۔

اے پسر مجھ سے ذوق نگاہ حاصل کر ۔ لا الہ میں کس طرح جلا جاتا ہے مجھ سے پوچھ ۔

اگر تو لا الہ کہتاہے تو جان سے، (دل سے) کہہ تاکہ تیرے جسم سے جان کی خوشبو آئے ۔

مہر و ماہ لا الہ کے نور سے گردش کر رہے ہیں ۔ میں نے پہاڑ میں اور کاہ میں یہ سوز دیکھا ہے
۔

یہ لا الہ کے دو حرف ، گفتار نہیں ۔ لا الہ سوائے تیغ بے زنہار کچھ نہیں ۔

اس کے (لا الہ کے)سوز سے جینا قہاری ہے ۔ لا الہ ضرب ہے اور ضرب کاری ہے ۔

اے مسلمان اس دیر کہن کا نقش ربی الاعلی کے دو حرفی تیشہ سے توڑ ڈال ۔

مومن پوشیدہ کو کس طرح فاش کرتا ہے ؟ یہ رمز لا موجود الا اللہ (اللہ کے سوا کوئی موجود نہیں) سے حاصل کر ۔

صرف ایسا شخص لا الہ کے ضمیر سے آگاہ ہے ۔ وہ تو لا موجود الا اللہ (اللہ کے سوا کوئی موجود نہیں) کی تلوار ہے ۔

علامہ اقبال کا دوسرا بڑا موضوع غیر کے آ گے نہ جھکنے کی تلقین پر مشتمل ہے وہ کہتے ہیں کہ غیر کے آگے جھکنے سے انسان اپنے تن و من کھو دیتا:

تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

ہندوستان کی ثقافت کو مسلمانوں نے اپنے علمی ، فنی اور تعمیری کارناموں کی مدد سے جس بام عروج تک پہنچایا تھا اس پر فخر نہ کرنا کفران نعمت میں شمار ہوگا۔تیرہ سو سال سے زیادہ عرصے پر محیط سلطنت اسلامیہ ہند نے ذات پات کے جس نظام کے خلاف شدید رد عمل کا اظہار کیا اس کے نتیجے میں مقامی مظلوم باشندونکی ایک بڑی تعداد نے اسلام قبول کیا اور اپنے ارد گرد کے ماحول کو پاکیزہ اور مقدس بنانے کے لیے دن رات محنت کی۔ مشہور اقبال شناس ڈاکٹر الف ۔د ۔ نسیم کا کہنا ہے’’ عہد حاضر میں مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت پر مغرب اور مغرب زدوں نے جو حملے کئے ہیں ان میں مذہب اور تصوف سر فہرست ہیں۔ اس حملے کا آغاز انیسویں صدی کے آغاز سے ہوا اور اس تندی و تیزی سے ہوا کہ مشرق و مغرب کو نور دینے والا مسلمان اس چراغ نور کو خود بجھانے پر آمادہ ہو گیا اور اس نے مذہب اسلام کو عہد قدیم کی ایک عمارت سمجھ لیا جس کی سیر تو کی جا سکتی ہے لیکن اس میں رہا نہیں جا سکتا ۔ تصوف جسے علمائے صالح اور صوفیائے کرام نے طریقت کہہ کر شریعت کا ایک حصہ قرار دیا تھا اس پر بھی ایسے تابڑ توڑ حملے ہوئے کہ ہم نے خود بھی اسے رہبانیت کہنا شروع کر دیا ۔ علامہ اقبال نے یوں تو اس زیاں پر اپنی شاعری میں بہت کچھ کہا ہے لیکن مثنوی پس چہ باید کرد کے عنوان حکمت فرعونی سے چند اشعار پیش کرکے اپنی بات کی تائید حاصل کروں گا

۔

وائے قومے کشتہ تدبیر غیر
کار او تخریب خود تعمیر غیر
می شود در علم و فن صاحب نظر
از وجود خود نگردد باخبر
نقش حق را ازنگین خود سترد
در ضمیرش آرزو ہا زاد و مرد
قوت فرماں روا معبود او
در زیان دین و ایماں سود او
از نیاگاں دفترے اندر بغل
الاماں از گفتہ ہائے بے عمل
دین او عہد وفا بستن بغیر
یعنی از خشت حرم تعمیر دیر
آہ قومے دل زحق پرداختہ
مرد و مرگ خویش را نشناختہ

ترجمہ (از ڈاکٹر الف ـد۔ نسیم) ۔ اس قوم پر افسوس ہے جو تدبیر غیر کی کشتہ ہے اس کا کام اپنی تخریب اور غیر کی تعمیر ہے ۔ (مراد مسلمان قوم سے ہے ۔ ایسی قوم علم و فن سے تو صاحب نظر ہو جاتی ہے لیکن اپنے وجود (ہستی)سے باخبر نہیں ہوتی ۔اس قوم نے نقش حق کو اپنے نگین سے نکال دیا ہے ۔ اس کے ضمیر میں جو آرزوئیں پیدا ہوتی ہینوہ مر جاتی ہیں ۔ اس کا معبود اپنے فرماں روائوں (یعنی انگریزوں) کی قوت ہے، ایمان کے زیاں میں وہ اپنا نفع سمجھتی ہے ۔ اس کی بغل میں اس کے بزرگان رفتہ (اسلاف) کا دفتر ہے لیکن الاماں کہ اس کا اپنے بزرگوں کی باتوں پر عمل نہیں۔ اس کا دین غیر سے عہد وفا باندھنا ہے ۔ یوں کہیے کہ وہ کعبہ کی اینٹوں سے مندر (گرجا)تعمیر کر رہی ہے۔ افسوس ہے ایسی قوم پر (یعنی دور حاضر کے مسلمانوں پر)کہ اس نے حق سے دل اٹھا لیا ہے (اس طرح اس نے اپنی موت خرید لی ہے) لیکن آہ وہ اپنی موت سے باخبر نہیں (وہ اس موت کو زندگی سمجھے ہوئے ہے(

اقبال کا ہندوستان کے اندر ایک مملکت نو کا تصورالہ آباد میں مسلم لیگ کے اجلاس میں دیا گیا تھا اس اجلاس کی صدارت علامہ محمد اقبال نے فرمائی تھی اس حوالے سے آغا شوکت علی نے اپنی کتاب ایک نئی لہر میں درست لکھا ہے کہ’’ یہ فطری بات ہے کہ وہ زمین کا کوئی ٹکڑا حاصل نہیں کر رہے تھے بلکہ ان کا حقیقی مقصد اسلام کو ایک موقع فراہم کرنا تھا تا کہ وہ اپنے اس تاریخی مقدر کی تحصیل کرسکے جسے عرب ملوکیت نے نظر انداز کر دیا تھا۔ یوں انہوں نے اسلامی سوشل جمہوریت کے قیام کے بارے میں اپنی تصور کو بھی نتیجہ خیز بنایا انہوں نے وہ رہنما بھی منتخب کیا جو اس مقصد کو پایہ ء تکمیل تک پہنچا سکتا تھا۔ اقبال نے قائد اعظم کو ایک خط لکھا اور ان سے درخواست کی کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت سنبھال لیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اور اقبال کی وفات کے صرف دو برس بعد قائد اعظم نے ۱۹۴۰ء میں قرار داد لاہور پیش کی۔ اس کے سات برس بعد پاکستان ایک حقیقت بن گیا۔ اپنے اقتدار کے مختصر عرصے کے دوران قائد اعظم نے ہمارے معاشرے میں موجود غربت کے تازیانے کی شناخت اور اس کی تخفیف پر زور دیا۔ انہوں نے اکثر اسلامی سوشلزم کی کی اصطلاح استعمال کی۔ خود اقبال نے بھی اس تجربے پر مثبت رد عمل کا اظہار کیا جسے انہوں نے ہمسایہ ملک میں ہونے والے ایک نئے معاشرتی تجربے کا نام دیا تھا۔‘‘

اقبال نے اپنی مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق میں لکھا ہے:

روس را قلب و جگر گردیدہ خوں
از ضمیرش حرف لا آمد بروں
آں نظام کہنہ را برہم زد است
تیز نیشی بہ رگ عالم زد است
کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ
لا سلاطیں، لاکلیسا ،لا الہ
فکر او در تند باد لا بماند
مرکب خود را سوئے الا نراند

آیدش روزی کہ از زور جنوں
خویش را زیں تندباد آرد بروں
یعنی روس جس کے قلب و جگر لہو ہیں
اس کے ضمیر نے بھی تو حرف لا ہی کا علم بلند کیا تھا۔
اس نے نظام کہنہ کو تاخت و تاراج کر دیا
اور دنیا کی رگ میں ایک تیز ڈنک اتار دیا۔
میں نے اس انقلاب کی پردہ داریوں میں جھانکا ہے
یہاں بادشاہت کی نفی ہوئی ہے
کلیسائی نظام کو مسترد کر دیا گیا ہے
خدا سے کنارہ کشی ہوئی ہے
یہاں فکر صرف لا کی آندھی میں گم ہو کر رہ گئی ہے
اس کے گھوڑے کا رخ الا کی جانب نہیں ہے
لیکن ایک دن ایسا بھی آئے گا جب وہ اپنی جنوں کے زور سے
اپنے آپ کو اس آندھی سے باہر نکال لے گا

پاکستان کو کسی غیر ملک سے کسی قسم کے تصور ریاست کی درآمد کی ضرورت نہیں ہے۔اقبال نے جس نظام فکر کو اسلامیان ہند اور ملت اسلامیہ کے لیے منتخب کیا تھا اس کا منبع و ماخذ کلام اللہ ہے۔ اور اس کلام کو اقبال کے مرشد مولانا روم نے اپنی عظیم الشان مثنوی معنوی کی بنیاد بنایا ہے جسے ہست قراں در زبان پہلوی بھی کہا گیا ہے۔اقبال کے کلام کی روح نے بھی کلام اللہ ہی کی روحانی دانش سے فیض پایا ہے اور اس میں جس نوع کے پاکیزہ ، مقدس اور استحصال سے پاک معاشرے کے نقوش ابھرے ہیں ان سے مکمل طور پر استفادہ کرتے ہوئے پاکستان کو حقیقی معنی میں مملکت خدا داد بنانا ہے کہ جس میں اللہ کی حاکمیت کے علاوہ کسی اور انسان یا ملک کی حاکمیت کا سکہ نہ چل سکے۔

المدد یا رسول اللہ المدد۔خواجہ الطاف حسین حالی نے درست لکھا تھا:
اے خاصہ خاصان رسل وقت دعا ہے
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

علامہ اقبال بیک وقت شاعر بھی تھے اور فلسفی بھی۔ ان دونوں حوالوں سے ان کے سامنے ایک متعینہ منزل تھی۔ انہوں نے اس منزل تک پہنچنے یا اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے باقاعدہ جدو جہد کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا مطلوبہ ہدف نہ صرف انہیں ملابلکہ اس کی رو شنی میں ملت اسلامیہ نے بھی اپنی از سر نو دریافت کے سفر کا آغاز کیا۔ اقبال کے مشوروں سے قائداعظم جیسے عظیم رہنما نے یوں فیض پایا کہ حصول پاکستان کے لیے ان کی جدوجہد تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ علامہ اقبال خواب پاکستان کے خالق تھے قائد اعظم نے قیام پاکستان کے لیے اپنی صحت کی پروا کیے بغیر شبانہ روز محنت کی اور یوں شاعر کے عظیم خواب کو حقیقی تعبیر عطا کی ۔اقبال کے پیغام کی بدولت کئی محکوم ایشیائی مسلم ریاستیں اپنی آزادی کے لیے کمر بستہ ہوئیں۔اقبال نے سنجیدگی سے مسلم دنیا کے ماضی اور حال

کا جائزہ لیا اور ان کے مستقبل کی جہت نمائی کا گراں قدر کارنامہ انجام دیا۔ اقبال کی طبیعت میں تحرک تھا ان کا نظریہ انقلاب بھی حرکت اور تغیر کے تصور سے مملو ہے۔ علامہ اقبال نے جس دور میں آنکھ کھو لی وہ ہندوستانی مسلمانوں کے ادبارکا دور تھا ۔محکومی ان کا مقدر بن گئی تھی ۔ بے بسی اور مایوسی کی لمبی تاریک رات ان کے سروں پر مسلط تھی ۔ مسلمان تعلیم اور مادی ترقی کی دوڑ میںپیچھے رہ چکے تھے۔ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے سر سید کے بعد سب سے موثر آواز اقبال ہی کی تھی،انہوں نے فلسفے اور قانون کا مطالعہ کر رکھا تھا۔ایک مضمون نے انہیں آزادی اور دوسرے نے حقوق کا احساس دلایا۔ان کے مقاصد کی تشکیل میں اس دور کی کی خارجی زندگی ، سیاسی ماحول اور ضروریات نے اہم کردار ادا کیا ۔ان کے دل میں آزاد ہونے کی تمنا پیدا ہوئی۔ اس حوالے سے وہ کارل مارکس کی تعریف بھی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کلیم بے تجلی تھا اور مسیح بے صلیب بھی! وہ کوئی پیغمبر تو نہیں تھا البتہ اس کے پاس معیشت اور انقلاب کے حوالے سے ایک ایسی کتاب تھی جو سرمایہ داری کے خاتمے کا کام کر سکتی تھی۔

وہ کلیمِ بے تجلی ! وہ مسیحِ بے صلیب
نیست پیغمبر و لیکن دربغل دارد کتاب

سرمایہ دارانہ معیشت اور نظام کے حوالے سے علامہ اقبال نے درست لکھا ہے کہ اس نظام میں امیر بخیل و عیش دوست ہو جاتے ہیں۔وہ مغز سے غافل ہو کر پوست میں بند ہوتے ہیں۔ امیر آدمی کے لیے فرمانروا کی طاقت معبودِہوتی ہے اس کا سود اس میں ہے کہ وہ دین و ایمان کو بھول جائے ۔وہ اپنے آپ کو امروز کی حدود سے باہر نہیں لاتا ۔اس کے روزگار میں مستقبل کا کوئی نقش موجود نہیں ہے:

منعمان او بخیل و عیش دوست
غافل ازمغز اندو اندر بندِ پوست
قوتِ فرمانروا معبودِ او
درزیاں دین و ایماں سودِ او
از حدِ امروز خود بیروں نجست
روزگارش نقش یک فردانہ بست

علامہ اقبال مسلم تاریخ اور فکر پر گہری نظر رکھتے تھے۔انہوں نے محسوس کیا کہ ایک عرصے سے مسلم دنیا پر انجماد اور ٹھہرائو کی کیفیات مسلط ہیں۔ان سے نجات پانا وقت کی اہم ضرورت ہے چنانچہ انہوں نے قرآنی فکر کو بنیاد بنا کر دنیا بھر میں موجود تبدیلی اور انقلاب کے تصورات کا باریک بینی سے جائزہ لیا اور پھر فیصلہ کن انداز میں کہا کہ مسلمان جب اسلام کی رسی مضبوطی سے تھام لیتا ہے تو اس کے لیے انسان دوستی اور اخلاقی بالیدگی کے رستے روشن تر ہو جاتے ہیں۔ مومن جب اپنی خودی پا لیتا ہے تو اس کے فکری اور انسانی امکانات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی تمنائوں کے وسیلے سے نئے نئے مقاصد تخلیق کرتا ہوا ستاروں پر کمندیں ڈالنے لگتا ہے۔ اس کا جذبہ اور طبیعت دونوں پر جوش ہو جاتے ہیں،اقبال نے راہبانہ ترک دنیا یا ابیقوریائی (Epicurean)لذت پرستی (Hedonism)دونوں کو مسلمانوں کے حق میں سم قاتل جانا ۔وہ مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں پر

امید تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں بے جا نوحہ خوانی کا عنصر موجود نہیں ہے۔اقبال زندگی کو بامقصد سمجھتے تھے اس لیے انہیں انسانی مستقبل سے گہری دلچسپی تھی ۔انہوں نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ حال کی عارضیت سے باہر آکر انسانی امکانات کی وسعتیں تلاش کریں۔دنیا کی تہذیبی ترقی میں یوں حصہ لیں کہ انسانیت اور انسان کا مستقبل دائو پر نہ لگے ۔

اقبال مغربی سائنسی ترقی کے خلاف نہیں تھے تاہم وہ سمجھتے تھے کہ نت نئی ایجادوں اور سائنسی انکشافات کو عظیم انسانی مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال ہونا چاہیئے۔اگر مغرب کی مادی ترقی انسانی مقاصد کی تکمیل کا وسیلہ ہوتی تو اقبال اس کی مذمت نہ کرتے۔افسوس یہ ہے کہ مغرب نے اس ترقی کے لیے آ ئندہ نسلوں کے لیے گڑھے کھود دیئے ہیں۔انفرادی اور ذاتی منفعت کی دلدلوں میں گھری مغربی آبادیاں بلند انسانی امکانات و مقاصدسے سروکار نہیں رکھتیں۔ان کی عقلیت پسندی کی انتہا انسان کشی ہے۔مغربی عقلیت پسندوں نے لغویت اور مہملیت کے فلسفے کا علم بلند کیا ہے۔کائنات کی ابسرڈٹی (Absurdity)کی بات کرتے ہوئے انسان کو مقاصد سے عاری ٹھہرایا ہے۔یہ نئے بو علی غبار ناقہ میں گم ہو گئے ہیں۔لیکن اقبال نے تو قرآن حکیم کے اس ارشاد کو اہمیت دی کہ ’’آسمان اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزیں ہم نے کھیل کے طور پر نہیں بنائیں ان کو برحق پیدا کیا ہے‘‘(القران(

یہ بھی ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ’’ہم نے آسمان اور زمین کو اور اس دنیا کو جو ان کے درمیان ہے فضول پیدا نہیں کیا‘‘۔اس لیے اقبال نے اپنے دور کے مسلمان سے کہا کہ وہ زندگی کے مقاصد کی شناخت سے عہدہ برآ ہو کر ان دشمنوں کے خلاف نبرد آزما ہو جائے جنہوں نے مادی سحر کاریوں سے عصر حاضر کے انسان کو مسحور کر رکھا ہے۔

اقبال کا خیال تھااقبال کا خیال تھا’’شاعر قوم کاوآباد بھی کر سکتا ہے اور برباد بھی‘‘ فن کو زندگی کی مثبت قدروں سے عبارت ہونا چاہیے۔اقبال کہتے تھے کہ فن شاعری سے انہیں کبھی دلچسپی نہیں رہی البتہ وہ مقاصد خاص رکھتے ہیں جن کے اظہار کے لیے ملکی حالات اور روایات کے حوالے سے انہوں نے شاعری کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ان کے مندرجہ ذیل اشعار ان کے تصور ریاست و معیشت کا منہ بولتا ثبوت ہیں کہ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مغربی شکم پروری کے تصورات کو پسند نہیں کرتے تھے:

عزبیاں گم کردہ اند افلاک را
درشکم جویند جانِ پاک را

....

تااخوت را مقام اندر دل است
بیخ او در دل نہ در آب و گلِ است

....

ہم ملوکیت بدن را فربہی است
سینہ بے نورِ او ازدل تہی است

....

مثل زنبورے کہ برگُل می چرد
برگ را بگذار دو شہدش برد
....
شاخ وبرگ و رنگ وبوئے گُل ہماں
برجمالش نالۂ بلبل ہماں

ہمارے لیے آج مطالعہ اقبال کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ گئی ہے کہ بڑی طاقتوں نے دنیا بھر میں مسلمانوں کے خلاف کئی سطحوں پر محاذ قائم کر رکھے ہیں۔اس حوالے سے ڈاکٹر صفدر محمود کے مضمون ’’مغربی میڈیا، انسانی حقوق، اسلامی بنیاد پرستی اور ہم‘‘ میں کیا عمدہ تجزیہ کیا ہے:’’موجودہ دور میڈیا(Media) کا دور ہے۔غور کیا جائے تو محسوس ہو گاکہ مغرب محض موثر اور طاقتور میڈیا کے ذریعے ہمارے ذہنوں پر حکومت کر رہا ہے۔یہاں ہم سے مراد صرف پاکستان ہی نہیں ہے بلکہ پاکستان جیسے وہ ممالک بھی اس فہرست میں شامل ہیں جہاں سیاسی شعور کا فقدان ہے۔جہالت عروج پر ہے اور تعلیم یافتہ ہر قسم کی راہنمائی کے لیے مغرب کی جانب دیکھتا ہے۔سچی بات تو یہ ہے کہ یہ ایک طرح سے ہمارے پڑھے لکھے طبقے کا احساس کمتری ہے کہ وہ مغرب کے ایجاد کردہ ہر لفظ، اصطلاح اور محاورے کو یوں قبول کر لیتا ہیجیسے یہ الہامی بات اور مقدس لفظ ہو۔چنانچہ اس طرح مغربی میڈیاوقتاًفوقتاً نئے نئے شوشے چھوڑتا رہتا ہے جن کا مقصد ہماری سوچ کا متاثر کرنا اور ہماری فکر کو ایک خاص رخ پر ڈالنا ہوتا ہے۔یاد رکھیے کہ یہ دور جسمانی غلامی کا نہیں، ذہنی غلامی کا ہے۔ماضی میں جب ضعیف قوموں کوغلام اور کمزور ملکوں کو تجارتی مقاصد کے لیے کالونی بنایا جاتا تھاتو مغربی ممالک نے پسماندہ اقوام کی ایک بڑی تعداد کو اپنا غلام بنا رکھا تھا۔اس دور میں انسانی حقوق کا کہیں ذکر نہیں تھاکیونکہ انسانی حقوق کا فلسفہ مغربی استعمار کے مفادات کے منافی تھا بلکہ مغربی استعمار کی نفی کرتا تھا۔اس طرح مغربی ممالک کئی صدیوں تک پسماندہ ممالک کو اپنی کالونیاں بنا کران کے وسائل کو اپنی صنعتی اور تجارتی ترقی کے لیے استعمال کرتے رہے۔اگر آپ لندن، پیرس اور روم جیسے خوبصورت شہروں کیبڑی بڑی شاہراہوں،عمارات اور صنعتی مراکز کی بنیادوں میں جھانکیں تو ان میں سے آپ کو اپنے بذرگوں کے خون اور پسینے کی خوشبوآئے گی۔‘‘

اس اقتباس کی روشنی میں اقبال کے ان تصورات کو بھی دیکھا جا سکتا ہے:

مرگ باطن گرچہ دیدن مشکل است
گل مخواں او راکہ درمعنی گل است
ہر زماں اندر تلاشِ سازو برگ
کار او فکر معاش وترسِ مرگ
جہانِ تست در دستِ خسے چند
کسانِ او بہ بندِ ناکسے چند
ہنرور درمیان کارگاہاں
کشد خود را بہ عیش کرگسے چند

نماند نازِ شیریں بے خریدار
اگر خسرو نباشد کوہکن ہست
اے کہ می خواہی نظامِ عالمے
جُستہٴ اورا اساسِ محکمے؟
تاندانی نکتہٴ اکل حلال
برجماعت زیستن گردد وبال
چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ
دستگیرِ بندہٴ بے ساز وبرگ!
ہیچ خیراز مردکِ زرکش مجو
لن تنالواالبر حتیٰ تنفقوا

اقبال نے اپنے دور کے پس منظر میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا آج کے دانشور ان کے بتائے ہوئے رستے پر چل کر آج کے عصری مسائل کے حوالے سے اسی قسم کے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔اقبال کے ثقافتی تناظر'' کے حوالے سے بنیادی طور پر ملی اور قومی مقاصد کو سامنے رکھا جا سکتا ہے۔آرٹ اور ادبیات پر گفتگو کرتے ہوئے اقبال یہ کہا کرتے تھے کہ فن ، ادبیات، شاعری ، مصوری ، موسیقی اور معماری وغیرہ زندگی کی معنویت اور خدمت گاری کے لیے ہیں۔اسی بنا پر وہ فن کو ایجاد و اختراع کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ یہ ان کے لیے آلہ تفریح نہیں تھا۔

/....../